چٹان کے پہلو میں کھڑی تھی۔ اُس نے آنکھیں اُٹھا کر سکوت کے عالم میں اسد کو دیکھا، اور اسد نے اس لمبے سے نوخیز چہرے میں (گو وہ عمر میں اُس سے چند سال بڑی تھی) اور پتلے پتلے مضبوط ہونٹوں میں اور دُور دُور جھلملاتی ہوئی آنکھوں میں (عین بیچ سے مانگ نکلے ہوئے ماتھے اور سیدھے سیاہ کس کر باندھے ہوئے بالوں میں) بدن کی قربت کے اس اولین بے زبان لمحے کو بجلی کی کاٹ کی مانند سر سے پاؤں تک محسوس کیا۔ وہ کپکپا اٹھا۔ اُس کو اس بات کا پتا تھا کہ اگلے لمحے یا اُس سے اگلے، یہ احساس بدل جائے گا، یا ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اِس لمحے کی نایابی اسی میں تھی کہ اِس کی یہ خالص سنسناہٹ، جو زندگی کے عمیق محوروں کو مسلسل مقناطیس کے مانند اپنی گرفت میں رکھتی ہے، جو دل کو ایک مُستقل شدّت کی سطح پر زندہ رکھتی ہے، جو بار بار آنے اور جانے پر بھی نہ گھٹتی ہے نہ بدلتی ہے، وہ صرف اِس لمحے کے اوّلین پن تک محدود ہے۔ اس بات کا اُس کو علم تھا۔ اس نے اس لمحے کو بیتابی سے مگر بے اُمیدی سے تھام کر رکھنا چاہا، مگر یہ ہوا کی طرح گزر گیا۔ وہ دونوں جنگل کے بالائی حصّے میں داخل ہوئے۔ یہاں پر جنگل زیریں حصّے کی طرح گہرا نہ تھا، یہاں دیودار کے درخت کھُلے کھُلے اُگے ہوئے تھے۔ یہاں کوئی جانور نہ رہتا تھا کہ گاؤں کے بہت قریب تھا، صرف گاؤں کے بچے یہاں بھیڑ بکریاں اور گائیں چرانے کے لیے آتے اور پیڑوں کے ساتھ بیٹھ کر گپیں لگاتے اور سویا کرتے تھے۔ جنگل کی یہ جگہ محفوظ تھی۔

اسد اُس سے ایک قدم آگے چل رہا تھا۔ کچھ دور پر وہ تنگ سا راستہ چھوڑ کر درختوں کے بیچوں بیچ چلنے لگے۔ یہاں پر تاریکی بہت تھی مگر اسد اس جگہ کے قدم قدم سے واقف تھا۔ وہ اندھیرے میں ایسے چل رہا تھا جیسے دن کی روشنی ہو۔ جیسے ہی کسی درخت کے پاس سے گزرتا اُس کے تنے کا رنگ، اُس کی گولائی، اُس کی چھال کی ساخت اُس کی آنکھوں میں پھر جاتی۔ یاسمین آسانی سے چلتی ہوئی اُس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ وہ ایک ایک درخت کو انگلیوں کے پوروں سے چھوتی، اور کسی کسی نوجوان تنے پہ بازو ڈال کر اُس کے بغیر، اُسے گلے لگاتی ہوئی چل رہی تھی۔ یاسمین اس جگہ پہ پل کر جوان ہوئی تھی۔ اسد کا مدھم سا ہیولا برابر اُس کی آنکھوں میں تھا —— لمبا اور پتلا، کندھوں کے خفیف سے جھکاؤ والا بدن، مگر تیز، بہت تیز اور ہلکا پھلکا جیسے چیتے کے پاؤں والا، گو اُس کو بہت چھو کر اُس نے نہیں دیکھا تھا مگر اُس کی تیزی اور حدت سے وہ واقف تھی۔ دفعتہً اُس کا جی چاہا کہ وہ بھاگ کر اسد کے برابر پہنچ جائے۔ اُس نے اپنے قدم تیز کر دیے۔ ایسے وقت میں ایسی جگہ پر، یاسمین نے سہم کر دل میں سوچا، میں کسی کی خاطر بھی نہ آؤں۔ اُسے دل میں ہلکے سے جُرم کا احساس ہوا اور وہ ہنستی ہوئی بھاگ کر اسد کے پاس سے نکلی اور ایک پیڑ کی اُبھری ہُوئی جڑ پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ اسد اُس کے پاس جا بیٹھا۔ یاسمین نے آہستہ سے اُسے سینے پر چھُوا۔ "تم نے سویٹر نہیں پہنی۔"

"نہیں" اسد نے کہا۔ "تمہاری سانس پھول گئی ہے۔"

یاسمین ہولے سے ہنسی۔

"ایسے وقت میں یہاں دوڑنا نہیں چاہیے۔" اسد نے کہا۔

"کیوں؟"

"یہاں بھیڑیے ہوتے ہیں۔"

"ارے جاؤ۔"

اسد اُچھل کر اپنے پنجوں پر بیٹھ گیا۔ پھر اُس نے ایک طرف کو مُنہ موڑ کر بھیڑیے کی آواز میں ایک لمبی ہُوک لگائی۔ یاسمین اُس کے بازو سے چمٹ گئی۔ دونوں خوشی سے اور بیتابی سے ہنستے رہے۔ اسد پھر اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں ہاتھ پھیلا کر اسد نے ایک لمبی ڈنڈی والا پہاڑی پھول توڑا اور یاسمین کے ہاتھ میں دے دیا۔ تاریکی میں اب وُہ بخوبی دیکھ رہے تھے۔

"رات کو مَیں نے تمہیں دیکھا تھا۔" یاسمین نے کہا۔

"کب؟"

"آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ تم میز پہ بیٹھے لکھ رہے تھے۔"

"کہاں سے دیکھا تھا؟"

"باورچی خانے سے۔"

"مَیں نے تمہیں نہیں دیکھا۔"

"تم نے اُدھر دیکھا ہی نہیں۔"

"دیکھا تھا۔ باورچی خانے میں اندھیرا تھا۔ تم اندھیرے میں کیا کر رہی تھیں؟"

"پانی پینے گئی تھی۔"

"کل رات تو سردی تھی۔"

"ہاں۔"

"تمہیں سردی میں پیاس لگی تھی؟"

"ہاں۔"

"اور وہاں تم نے کیا کیا؟"

"کچھ نہیں۔"

"کتنی دیر کھڑی رہیں؟"

"پتا نہیں۔" یاسمین نے کہا، "کافی دیر۔"

"مَیں نے اُدھر دیکھا تھا؟"

"ہاں۔"

"کئی بار؟"

"ہاں۔" یاسمین نے کہا، "کیا لکھ رہے تھے؟"

"خط۔"

"چچا کو؟"

"ہاں۔"

"تمہارے چچا یہاں کبھی نہیں آتے۔" یاسمین نے کہا، "تمہارے چچا یہاں کیوں نہیں آتے؟"

"چچا بہت بوڑھے ہوگئے ہیں۔"

"اس بار تم گئے تو اُن سے ملے تھے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

اسد خاموش رہا۔

"تم نے مجھے بتایا تھا کہ دُنیا میں تمہارے ایک چچا ہیں، اور ایک پھوپھی اور کوئی نہیں۔"

"ہاں۔"

"اسدی، یاسمین نے کہا، "بعض دفعہ میں سوچتی ہُوں تم بہت ہی عجیب آدمی ہو۔"

"کیسے؟"

"تم نے اپنے بارے میں مجھے کچھ بھی تو نہیں بتایا۔"

"جو کچھ مجھے پتا ہے مَیں نے بتا دیا ہے۔"

وہ اُٹھا اور کمر تنے کے ساتھ ٹکا کر سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اُس نے سر کر دائیں اور بائیں آہستہ آہستہ جھٹکے دیے، جیسے کسی خیالی لوجھ کو اُتار کر پھینک رہا ہو۔ جہاں وہ بیٹھی ہے، اُس نے بے خیالی سے سوچا، مَیں آسانی

کے ساتھ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتا ہوں۔ وہ پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

"پتا ہے تمہارا نام کیسے رکھا گیا تھا، یاس؟"

"کیسے؟"

"تمہارے باپ نے مجھے بتایا تھا۔"

"بتاؤ؟"

"جب وہ تمہیں یہاں لے کر آیا تو تم بہت چھوٹی سی تھیں۔ اس وقت شاید تمہارا کوئی اور نام تھا۔"

"فاطمہ۔"

"فاطمہ اچھا نام ہے۔"

"ہاں۔"

"اس نے اس پاس کے پہاڑوں پہ بہت ڈھونڈا مگر جس پھول کا وہ عمر بھر سے دلدادہ تھا وہ یہاں کہیں پہ نہ ملا۔ پھر اس نے میدانوں سے یاسمین کے بیج اور پودے تک منگوائے، مگر اس زمین نے انہیں قبول نہ کیا۔ آخر اس نے تمہارا نام یاسمین رکھ دیا۔"

"فاطمہ یاسمین۔"

"یہی کہانی ہے نا؟"

"ہاں۔"

"میرا خیال ہے یہ کہانی تمہارے باپ نے گھڑی ہے۔"

"ابا کو کیا ضرورت ہے گھڑنے کی؟"

"تمہیں خوش کرنے کے لیے۔"

"ابا نے کوئی بات نہیں گھڑی۔ یہ سچی بات ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا ہے؟ تم تو چھوٹی سی تھیں۔"

"مجھے پتا ہے۔" یاسمین قطعی لہجے میں بولی۔ "مجھے سچی لگتی ہے۔"

اسد بلاوجہ دھیمے دھیمے غصے کی حالت میں تھا۔

"جب میں چھوٹی سی تھی،" یاسمین نے بات کی، "تو ہر وقت یہاں گھوما کرتی تھی۔ اکیلی۔ مجھے کسی شے سے خوف نہ آتا تھا۔ دوسری لڑکیاں غول در غول آتی تھیں، میں اکیلی کھیلا کرتی تھی۔ میں ہر ایک پرندے،

ہر ایک جانور، ہر ایک پتھر سے واقف تھی۔ پھر میں مظفر آباد سکول میں چلی گئی۔ ان جگہوں کے ساتھ میری واقفیت ختم ہو گئی۔ اب میں صرف رات کے اندھیرے میں تمہارے ساتھ یہاں آتی ہوں۔"

اسد نے اُس کی آواز میں رنجیدگی کی لغزش محسوس کی۔ "پر اس جگہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔"

"کبھی پہاڑ بھی بدلے ہیں؟" اسد نے کہا۔

"شاید بدلتے ہوں۔" کچھ دیر تک وہ خاموش رہی۔ "اسد؟"

"ہُنہہ۔"

"تم نے میرے نام کی بات کیوں چھیڑی تھی؟"

"ایسے ہی۔" اسد نے جواب دیا۔ "میں نے ایک نظم شروع کی ہے۔"

"کیسی نظم؟"

"ایک نظم۔ کئی بار شروع کی ہے۔"

"کیا لکھنا چاہتے ہو؟"

"پتا نہیں۔ مگر تمہیں علم ہے کہ آدمی کی زندگی پر اُس کے نام کا بُرا اثر ہوتا ہے؟"

"کیسے؟"

"ہر ایک نام کی ایک آواز ہوتی ہے۔ یہ تو تمہیں پتا ہی ہے۔"

"ہاں۔"

"اس کے علاوہ اُس کی ایک شکل و شباہت اور اپنی ایک جان ہوتی ہے۔ ہر بار جو یہ نام پکارا جاتا ہے تو بولنے والی آواز کے جذبے کے مطابق، یعنی جوش یا غصے یا محبت کے مطابق جا کر اپنے ستارے سے ٹکراتا ہے۔"

"گویا اگر میرا نام یاسمین ہے تو پھر؟"

"یہ مجھے پتا نہیں۔" اسد نے کہا۔ "بس اتنا پتا ہے کہ نام کا تمہارے اُوپر اثر ہوتا ہے۔"

"کوشش کرو تو شاید لکھتے لکھتے پتا چل جائے؟"

"شاید۔"

"تم نے مجھے بتایا تھا کہ نظم لکھنے کے دوران تمہیں ایسی ایسی باتوں کا پتا چلتا ہے جن کا پہلے خیال بھی نہیں ہوتا۔"

"ہاں۔"

کوشش کر کے لکھو گے نا؟

"کوشش کی بات نہیں ۔" اسد نے کہا، "قسمت کی بات ہے ۔"

قسمت کی بات محض اس لیے نہیں کہ کبھی کبھار وہ کوئی نظم لکھ لیتا تھا، بلکہ اس لیے کہ وہ یاسمین کے بارے میں اور اُس کی خاطر کوئی بات کہنا چاہتا تھا، کوئی ایسی بات جو جھوٹ نہ ہو، جو من گھڑت یا خیالی نہ ہو بلکہ اصلی اور سچی ہو۔ وہ اُس کی زندگی کا پہلا سچا مرد بننا چاہتا تھا۔ اُسے احساس تھا کہ کوئی مرد کسی عورت کے لیے شاید اِتنا کچھ ہی کر سکتا ہے۔ وہ اپنی خواہش کے مبہم، بلکہ مُہمل ہونے تک سے خائف تھا۔ اُسے دراصل یہ بھی ٹھیک سے پتا نہ تھا کہ کسی عورت کے ساتھ سچائی کا دعویدار ہونا کیا ہوتا ہے، یہ کس طرح کی چیز ہے، کیا اس کا کوئی مفہوم بھی ہے، اس سے آرام ملتا ہے یا کوئی رنج ہوتا ہے، یا اس کا آخر کوئی فائدہ بھی ہے؟ تاہم اپنے اندر جہاں یہ وہ چیزوں کے مفہوم اور اُن کی نوعیت کی کسی نہ کسی طور، کچھ نہ کچھ خبر رکھتا تھا اُس مقام کے اندر اُس کو اس بات کا فہم تھا کہ زیادہ سے زیادہ جو وہ یاسمین کی خاطر کر سکتا تھا تو اُس کے ساتھ سچائی کا دعویٰ کر سکتا تھا، اور بس . . . . یاسمین اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اسد کا ہاتھ اندھیرے میں بے اختیار اُس کی جانب لپکا۔ انگلیوں کے پوروں نے اُس کی قمیض کے دامن کو چھوا، پھر ہاتھ ہوا میں معلّق رہا نیچے اِس کے —— اُس نے سوچا —— سفیدے کے نوجوان تنے کی مانند لمبی اور گول، نرم اور مضبوط اور صاف سُتھری اور پارے کی لہر کی طرح تھرکتی ہوئی، بدن کی ایک پوشیدہ نہنی ہے جس کی مجھے خبر نہیں۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے ایک درخت سے دُوسرے اور دُوسرے سے تیسرے تک گھومتے رہے۔

"جانتے ہو"، یاسمین بولی، "ایک مدّت تک مجھے تمہارا پتا ہی نہ چلا تھا۔ اُس زمانے میں تم گھر کی طرف آتے ہی نہ تھے ۔"

"آتا بھی تو تمہیں دیکھ تو نہ سکتا تھا ۔"

"مگر میں تمہیں دیکھ لیتی ۔"

"ہاں ۔ اور میں شاید تمہاری آواز ہی سُن لیتا ۔"

"پتا ہے میں نے تمہیں پہلے پہل کب دیکھا تھا؟"

"کب؟"

"تمہارے جانے سے دو دن پہلے۔ شام کا وقت تھا اور تم مطب کی دیوار کے ساتھ کھڑے نیچے دیکھ رہے تھے۔ میں کسی کے گھر جانے کے لیے باہر نکلی تو میری نظر تم پر پڑی۔ میں سمجھی تم کوئی مریض ہو ۔"

"درست ۔"

"جب میں باہر سے لوٹی تو رات پڑ چکی تھی اور تم ابھی تک وہاں کھڑے تھے، گھر کی جانب پُشت کیے، پتھر کے بُت کی طرح۔ آسمان پہ اُس رات کو چھوٹا سا چاند تھا۔ یکدم میرا جی چاہا کہ تمہیں دیکھوں۔ اندر جانے کی بجائے میں دروازے سے ذرا آگے نکل آئی، تاکہ تمہارا سر آسمان کے سامنے آجائے۔ وہاں ایک لحظے کے لیے رُک کر میں نے تمہیں دیکھا اور پھر واپس چلی گئی ..... مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ تم ہمارے علاقے سے نہیں ہو۔"

"کیسے؟"

"تمہارے کھڑے ہونے کے انداز سے۔ تمہاری کُہنیاں دیوار پر اور مُٹھیاں ٹھوڑی کے نیچے تھیں۔ تم ایک ٹانگ کے بل کھڑے تھے، دُوسری ٹانگ ڈھیلی ڈھالی پاؤں کی ٹرک پر ٹکی تھی۔ اس علاقے کا کوئی آدمی ایسے کھڑا نہیں ہوتا۔ تم شہر سے آئے تھے۔ دو روز کے بعد تم گاؤں چھوڑ کر چلے گئے۔ میں سمجھی تندرست ہو کر واپس چلے گئے ہو۔"

"تندرست ہو کر!" اسد طنز سے بولا، "یہاں سے؟"

"تمہارا خیال میرے دل پر رہا۔ کبھی کبھی میں اپنے آپ پہ ہنستی۔ میں نے تمہارے بیولے کو رات کے اندھیرے میں کئی گز کے فاصلے سے صرف ایک لحظے کے لیے دیکھا تھا۔ مگر اُس ایک لمحے کے بعد میں لاکھ کوشش کرتی، تمہارا خیال دل سے نہ جاتا۔ کیسی عجیب بات ہے۔"

خُون کے اُبال سے اسد کے رونگٹے اکڑ گئے اور ایک بے نام سی کپکپی اُس کے بدن میں دوڑ گئی، جیسے ننھی ننھی، نہایت ہی باریک پھوار پڑتی ہو۔ اُس وقت پہلی بار شیر کے بولنے کی آواز آئی۔ اسد تیزی سے پلٹا۔ اُس نے لپک کر یاسمین کا بازو پکڑا اور اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہ آواز باقاعدہ گرج کی بجائے ایک چنگھاڑ کی آواز تھی، کٹی پھٹی، بے ربط، اور خونخوار۔ اسد کو یہ اندازہ نہ ہوا کہ آواز کس جانب سے آئی ہے، مگر کہیں قریب سے آئی تھی۔ اُس کی کپکپی رُک گئی۔ اُس کے جسم کو دفعتہً جیسے آرام مل گیا۔ اب وہ ہلکا پھلکا، چاق و چوبند کھڑا تیز تیز آنکھوں سے اندھیرے میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر تک دونوں ساتھ لگ کر کھڑے چنگھاڑ کے بعد کی گہری خاموشی کو سُننے کی کوشش کرتے رہے۔ اُوپر کسی درخت سے ایک پرندہ نہایت آہستگی سے اڑا تو وہ یوں چونک اُٹھے جیسے اُن کے سروں کے اُوپر دھماکا ہوا ہو۔ پھر اسد نے قریب ہی ایک رائفل کے سیفٹی کیچ کی آہنی کلک کی آواز سُنی۔

"شاہ رُخ!" وہ چلا اُٹھا۔

"چیخو مت!" اندھیرے میں آواز آئی، "بیوقوف

شاہ رُخ اِس علاقے کا فارسٹر تھا۔ اِس کے علاوہ وہ یہاں کی واحد رائفل کا مالک تھا۔ وہ سرحد کے علاقے کا رہنے والا صاف ستھرا نوجوان تھا اور اسد سے اُس کی دوستی تھی۔ اپنے طور پر شاہ رُخ بھی شیر کی تاک میں تھا اور رات رات بھر اپنے ڈاک بنگلے کے برآمدے میں سیفٹی کیچ اُتار کر بیٹھا انتظار کرتا رہتا تھا۔ اسد کئی بار دل ہی دل میں یہ سوچ کر ہنسا تھا کہ پاگل آدمی سمجھتا ہے کہ شیر شاید اُس کو ڈھونڈتا ہوا ڈاک بنگلے آئے گا۔ اِس وقت اُس کو یہاں پا کر ایک لمحے کو اسد کو خیال ہوا کہ شاید شاہ رُخ بالآخر شیر کے تعاقب میں باہر نکل آیا ہے۔ مگر اگلے ہی لمحے اُس نے ایک لڑکی کی سرگوشی، اور جواب میں شاہ رُخ کی آواز سنی تو اُس کا دل ٹھہر گیا۔ یہ عالم پٹواری کی بیٹی حُسنہ تھی جس سے ملنے شاہ رُخ یہاں آیا کرتا تھا جُسنہ اور یاسمین کے رازوں میں اُن کا اشتراک تھا۔

"میں سمجھا تم گولی چلانے والے ہو۔" اسد ہنستے ہوئے بولا۔

"تمہاری آوازیں تو ہم ایک گھنٹے سے سُن رہے ہیں۔ سارے جنگل میں شور مچا رکھا ہے تم دونوں نے۔" شاہ رُخ نے جواب دیا، "سیفٹی عادتاً اُتار لی تھی۔ آواز تو اس ظالم کی ایسے آتی ہے جیسے بغل میں کھڑا ہو، ہو نہ ہو اصل کہیں اور ہے۔"

"دن کے وقت کہاں جاتا ہے؟" اسد نے پُوچھا۔

"کہیں بھی نہیں جاتا۔ پڑا سوتا ہے۔"

"پھر اسے ڈھونڈنے کا بہترین وقت دن میں ہی ہے۔"

"سہ پہر میں۔ اُس وقت یہ جانور گہری نیند سوتے ہیں۔" شاہ رُخ نے کہا، "مگر ہو سکتا ہے یہ جو ہے سوتا ہی نہ ہو۔"

"کیوں؟"

"اکیلا جو ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا کہ اکیلا ہے؟"

"آواز۔" شاہ رُخ نے کہا۔ "ہمیشہ ایک ہی آواز میں دہاڑتا ہے۔ اضطراب کی کیفیت میں۔"

"تمہیں ان کی آوازوں کا فرق معلوم ہے؟"

"نہیں۔" شاہ رُخ نے کہا، "مگر مجھے ایسا احساس ہے کہ یہ اکیلا ہے۔ جیسے یہ چنگھاڑتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی جوڑی ساتھ نہیں۔"

اسد کا اِس بات پر شاہ رُخ سے بہر طور اتفاق تھا۔ ان کی حسیات اس بارے میں مُشترک تھیں۔ فرق یہ

تھا کہ اسد اس بات کو دل میں رکھے ہوئے تھا۔ اسے اس بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ جیسے یہ کوئی راز ہے جو اُس کے ہاتھ سے نکل جائے گا ـــــ امید و بیم کی ایسی کیفیت کے مانند جو دل و دماغ پہ چھا جاتی ہے اور جوں جوں بڑھتی اور بتدریج حقیقت میں تبدیل ہوتی جاتی ہے، زیادہ سے زیادہ بے ہئیت اور بے یقین ہوتی چلی جاتی ہے، ہوا بنتی جاتی ہے۔ آدمی کے خیال اور اُس کی خواہش کے قلب میں جو تضاد بیٹھا ہوتا ہے، اس کا دھڑکا اُسے لگا رہتا تھا۔ وہ دونوں کھڑے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ مستقبل کے کسی وقت پہ اس جانور کے مقابل آنے اور اُسے اپنے قابو میں کرنے کے ان دونوں کے اپنے اپنے منصوبے تھے۔ دونوں لڑکیاں اگلے درخت کے ساتھ لگ کر کھڑی تیز تیز سرگوشیاں کر رہی تھیں اور ہونٹ دبا دبا کر پیٹ میں ہنستی جا رہی تھیں۔ وقفے وقفے پر حسنہ اونچی آواز میں کہتی: "ہائے پاس۔ مجھے خوف آتا ہے۔" اور شاہ رُخ اُس کی بات کو ہنسی میں اُڑانے یا اُن دونوں کو مزید خوفزدہ کرنے کے لیے کوئی بات کرتا۔ تھوڑی دیر میں شاہ رخ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

"تمہارے کتروں کا کیا حال ہے؟" اسد نے پوچھا۔

"کام چل رہا ہے۔ مگر میں ان کی دُم پر پاؤں رکھنے کے لیے موجود نہ ہوں تو شاید گھر پہ ہی بیٹھے رہیں۔" شاہ رُخ نے کہا، "ایک فائدہ ہوا ہے، چوری چکاری ساری رینج میں رُک گئی ہے۔ شام کے بعد کسی کی ہمّت ہی نہیں ہوتی۔"

"کسی نے اسے دن میں دیکھا ہے؟"

"اونہوں۔" شاہ رُخ نے سر ہلایا۔ "تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟"

"اب ٹھیک ہوں۔"

اُن کو لمبے راستے سے درختوں کے اندر اندر گاؤں کے گرد گھوم کر کہیں عقب میں جا کر نکلنا تھا جہاں حُسنہ کا گھر تھا۔ چنانچہ وہ اسد سے ہاتھ ملا کر، حسنہ کو ساتھ لے کر جنگل کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔ کچھ دور تک اُن کے قدموں کی آواز آتی رہی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

اسد اور یاسمین تقریباً جنگل کے کنارے پہ پہنچ چکے تھے جب وہ دُوسری بار بولا۔ اِس دفعہ یہ پُورے گلے کی، گونجدار گرج کی آواز تھی جس سے یاسمین اُچھل پڑی۔ دونوں ہاتھوں سے اسد کا کندھا پکڑ کر وہ اُس سے لپٹ گئی، پھر ایک دم علیحدہ ہو کر کھڑی ہو گئی۔

"ڈر گئیں؟"

"اِتنا اچانک دھاڑا ہے۔ بس۔" وہ بولی، "ڈرنے کی کیا بات ہے۔"

"بات تو ہے۔"

"کیوں ؟"

"لوگ ڈرتے تو ہیں اس سے ۔"

"میں نہیں ڈرتی ۔" یاسمین نے کہا ، "لوگ ڈرتے ہیں تو ڈرتے رہیں ۔"

"آج یہاں آتے ہوئے تمہیں خوف نہیں آیا ؟"

"نہیں ۔"

"تمہیں پتا ہے کہ یہ یہاں تک آتا ہوا دیکھا گیا ہے ؟"

"دلی کی بات کا کیا اعتبار ۔ وہ تو ہر وقت سوار رہتا ہے ۔"

"تم نے اس کی دہاڑ نہیں سُنی ؟"

"سُنی ہے ، اسد ۔ تم نے تو شاید پہلی بار سُنی ہوگی ۔ یہاں پہ ایسے ایسے باگھ ہر دُوسرے سال آیا کرتے ہیں ۔"

"یہ باگھ کی آواز ہے ؟"

"یہ کوئی ذرا بڑا باگھ ہوگا ، بس ۔ اور کچھ بھی نہیں ۔"

"کیسے کچھ نہیں ؟" اسد نے ضدی لہجے میں کہا ۔

"کچھ بھی نہیں ۔" یاسمین اب آہستہ آہستہ غصّے میں آ رہی تھی ۔ "کچھ نہیں ۔" اُس نے دہرایا ۔

اُس وقت تیسری بار گرج کی آواز آئی ۔ اب کے یاسمین اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں ، آنکھ جھپکے بغیر متوازن نظروں سے اسد کو دیکھتی رہی ۔ اسد اُس سے ایک بازو کے فاصلے پر کھڑا کبھی اُسے اور کبھی مُڑ کر گرج کی سمت میں دیکھتا رہا ۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر یاسمین کو چھُوئے ، رات کے اندر اُس کے جُثّے کو ، اُس کے جسم کو محسوس کرے اور اس طرح اُس اندھیرے کی آواز کو معدوم کر دے ۔ مگر اُس کا بدن جیسے ماتھے سے لے کر نیچے پاؤں کے بیچ کی زمین تک دو حصوں میں بٹ چکا تھا ، اُس کی بوٹی بوٹی مخالف سمتوں میں لپک رہی تھی اور بیچ کی اِس کاٹتی ہُوئی لکیر نے اُسے مفلوج کر کے رکھ دیا تھا ۔ اُس کے آگے اور اُس کے پیچھے صرف اُس کی نگاہ اور اُس کی خواہش دوڑ رہی تھی ، اُس کا تمام اُس کے بدن کی طرح سکوت میں تھا ، وہ ہاتھ کی ایک انگلی تک کو جنبش نہ دے سکا ۔ چند لمحوں میں اُس پر سے اس عجیب عزیب کیفیت کا ایک عالم گزر گیا ۔ آخر یاسمین نے سرکشی کی ایک جنبش کے ساتھ اپنی ٹکٹکی کی تار توڑی اور منہ موڑ کر چل کھڑی ہُوئی ۔ کھُلے آسمان کے نیچے پہنچ کر یاسمین نے آنکھوں کے کونوں میں سے دیکھا کہ اسد اُس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے ۔

"اسد ۔" وہ بولی ، "ایک بات پُوچھوں ؟"

"ہاں۔"

"سچ سچ؟"

"ہاں، یاسمن۔"

"تم واپس کیوں آئے تھے؟"

"کہاں؟"

"یہاں۔"

وہ ہنسا: "تمہارے لیے۔"

"اُس وقت تم مجھے جانتے بھی نہ تھے۔"

"مَیں نے تمہیں خواب میں دیکھا تھا۔" وہ دوبارہ ہنس کر بولا۔

"اُوپر آنے سے پہلے تم ایک رات ڈاک بنگلے میں رہے تھے۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"حُسنہ نے۔" وہ بولی۔ "تم واپس کیوں آئے تھے، اسد؟"

"بتایا جو ہے، یاسمن۔" اسد نے کہا۔ "تمہارے لیے۔"

★ ★ ★ ★ ★

درحقیقت وہ یاسمین کی خاطر آیا تھا نہ شیر کی خاطر، وہ دوبارہ اس لیے یہاں واپس آیا تھا کہ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ جھوٹ بولنے میں وہ ایک طرح سے طاق تھا۔ سالہا سال تک چچا کے گھر رہتے اور تنِ تنہا پل کر جوان ہوتے ہوئے اسد نے چند چیزوں میں مہارت حاصل کی تھی۔ اُن میں ایک چیز کہانیاں بھی تھیں۔

پہلے پہل وہ بڑے دُکھ میں رہا تھا۔ مگر اُس وقت وہ اتنا چھوٹا تھا کہ اُسے پتا بھی نہ چلا کہ اُس کے اس درد کی وجہ کیا تھی۔ بعد میں جب وہ سمجھنے کے قابل ہُوا تو اُسے پتا چلا کہ وہ اس وجہ سے دُکھی رہا تھا کہ تنِ تنہا تھا۔ سکول میں اُس کے ساتھی تھے اور دو دوست بھی تھے۔ پہلے اُس کے دوست اُن کے گھر کھیلنے کے لیے آیا کرتے۔ اُن کا

گھر بچوں کے کھیل کی جگہ تھی ۔ دُوسرے گھروں میں مائیں تھیں جو بچوں کو ڈانٹتی رہتی تھیں، یہ نہ کرو، وُہ نہ کرو۔ اور باپ تھے جن کے آنے پر بچوں کی شوخی پر اوس پڑجاتی ۔ اسد کے گھر میں صرف ایک بوڑھی خادمہ تھی، اور پھوپھی اُٹھ گئیں جو چل گئیں ۔ بچے پہلے گلی میں کھیلتے، گلی سے تھک جاتے تو گھر کے اندر چلے آتے اور اندر ابا ہوتے ۔ وہ بچوں کو کسی بات پر بھی منع نہ کرتے ۔ سارے محلے میں ایک اُن کا گھر ایسا تھا جہاں چھپو چھپک چڑلیاں کھیلنے کی آزادی تھی۔ گھر بھر کی دیواریں، دروازے، تاریک پوشیدہ گوشے کوئلے اور چاک اور پیلی گاچنی کی چھوٹی چھوٹی لکیروں سے اٹے پڑے تھے ۔ ابا کبھی کبھی خود اُن کے کھیلوں میں شریک ہوجاتے ۔ جب ’’چھپو چھپک چڑلیاں، دو تیریاں دو میریاں‘‘ کا نعرہ لگنے پر تلاشی شروع ہوتی تو لکیروں کی گنائی اور کٹائی میں وہ ان کا ساتھ دیتے ۔ بعد میں اگر بھوک لگی ہوتی تو دُودھ کے پتیلے میں سے ایک ایک گلاس دُودھ، اور دو دو چار چار پیسے ہر ایک کو خرچنے کے لیے بھی ملتے ۔ اسد اور اُس کے ابا کا گھر متوسط آمدنی والا گھر تھا مگر وہاں پہ چیزوں کی اور جگہوں کی چھوٹ تھی ۔ چچا امیر تھے اور اُن کا گھر بھی بڑا تھا، مگر وہ چُپ چاپ اور الگ تھلگ رہا کرتے جیسے مقبرہ ہوتا ہے ۔ اُن کے گھر کوئی بھی کھیلنے کو نہ آتا ۔ اُس گاؤں سے صرف چند بچے ہی شہر کے سکول میں پڑھنے جاتے تھے، اور وُہ بھی پیدل ۔ چنانچہ بائیسکل پہ ساڑھے تین میل ایک طرف اور اتنا ہی دوسری طرف کا کچی سڑک کا راستہ ہر روز طے کرنا پڑتا ۔ سات میل کا یہ سفر کڑی تنہائی کا سفر تھا ۔ بارش کے موسم میں کچے راستے کیچڑ میں بدل جاتے اور کیچڑ پہیوں کے ساتھ گھومتا ہوا آ کر مڈگارڈوں میں پھنس جاتا ۔ وہ بھاری ہوتے ہوتے پنڈلیوں پر زور لگائے جاتا، لگائے جاتا، حتیٰ کہ پہیے جام ہوجاتے ۔ پھر کھڑے ہوئے سائیکل پہ توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں ایک لحظہ پھڑپھڑاتا ہوا اگلا پہیہ ——— اور وہ دھپ سے ایک پاؤں پر کیچڑ میں گر پڑتا، پھر ٹانگ گھما کر سائیکل سے اُتر جاتا اور اُس کو کھینچتا ہوا راستے کے کنارے تک لے جا کر سٹینڈ پہ کھڑا کر دیتا ۔ پھر وہ پاؤں کے بل بیٹھ جاتا اور ایک ہاتھ سے سائیکل کے ڈنڈے کو پکڑ کر دُوسرے ہاتھ کی انگلیاں مڈگارڈ کے کیچڑ میں گاڑ دیتا ۔ ’’اُلو کے پٹھے، حرامزادے‘‘، وہ مڈگارڈوں کو دل میں اپنی بڑی بُری گالیاں دیتا ۔ ہر دو چار سَو گز کے فاصلے پر اُسے غیر متحرک، کپکپاتے ہُوئے سائیکل سے واسطہ پڑتا اور اُترنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا ۔ ایسے موسم میں ہر دو سو چار سو گز پر دو پاؤں کے بل، ایک ہاتھ سے سائیکل کو تھامے دُوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے مڈگارڈ اور پہیے کے درمیان پھنسے ہوئے سخت گاچی کے کیچڑ کو اُکھاڑ اُکھاڑ کر نکال رہا ہوتا جب کہ بارش کے چھینٹے اُس کے مُنہ پہ طمانچے مارتے، آنسوؤں سے مل کر گردن پر اور سینے سے ہو کر پیٹ سے نیچے تک بہتے چلے جاتے ۔ پھر تانگے اور گدّے چلتے اور کیچڑ میں گہری گہری کھالیں بنا ڈالتے جو بارشوں کا موسم نکلنے پر دھوپ میں سُوکھ کر سخت ہوجاتیں ۔ اُس موسم میں گاؤں کا راستہ ایسی ایسی تنگ کھالوں سے اٹا پڑا ہوتا، جیسے سٹیشنوں کے ساتھ شنٹنگ کے علاقے میں لائنوں کا جال بچھا ہوتا

ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا کہ وہ زمین کے اُوپر ہوتی ہیں اور یہ زمین کے اندر۔ اس راستے پر سائیکل چلانا جان جوکھم کا کام ہوتا۔ قدم قدم پر یہ خدشہ کہ پہیہ کسی کھال میں نہ پھنس جائے۔ اگر پھنس جاتا تو یُوں لگتا جیسے کسی تیز رفتار چلنی کے اُوپر جو آٹا چھنے والی پکّیوں کے ساتھ لگی ہوتی ہے چل رہے ہوں پھر اُترے بنا چارہ نہ ہوتا۔ مادرچود۔ ایک دو برس میں اُس کی گالیاں بھی بڑی ہو گئیں اور وہ اُونچی آوازمیں اور کبھی دل میں سوال کرتا۔ یہ سڑکیں یہاں مادرچود ہے تیز سفید دھوپ کی چادر آنکھوں کو لگتی اور ایک نہایت مہین سی گرد ہوا میں اُڑتی جس کی تہہ کی تہہ چہرے پہ بیٹھ جاتی اور جس پر آنسو کبھی کبھی نہروں یا نالیوں کی شکل بنا کر خشک ہو جاتے۔ گھر پہنچنے پر وہ سائیکل صحن میں کھڑی کرکے نلکے کی بجائے سیدھا اندر کی جانب جاتا۔ وہاں وہ دیوار پہ ٹنگے ہوئے شیشے میں ان نشانوں کو نہایت غور سے آنکھیں کھول کھول کر اور گالوں کو انگلیوں سے کھینچ کھینچ کر دیکھتا اور اُن کے روز بروز بدلتے ہوئے نقشے پر حیران ہوتا۔ پھر چچا کا سامنا کرنے سے پہلے نلکے پر انہیں رگڑ رگڑ کر مٹا دیتا۔ چچا اُس حال احوال پُوچھنے کے عادی نہ تھے، بس کوئی ایک آدھ بات کبھی کبھار کر لیتے۔ اکثر وہ خود ہی خوش طبعی سے سکول کی، راستے کی اور گھر کی چھوٹی چھوٹی خوشگوار من گھڑت باتیں کرتا رہتا۔ ایک عرصے تک وہ یُوں ہی ایک بے نام سے احساس کے لیے رہتا گیا جس کے سر پیر کی بھی اُسے خبر نہ ہوتی، جس کو بعد میں (بہت بعد میں) اُس نے تنہائی کا نام دیا۔ حتیٰ کہ ایک روز وہ بے وجہ طور پر غصّے سے تقریباً بلبلا اُٹھا۔ اُس نے اپنی چارپائی کے پایوں کو ٹھڈے مارے، باہر آکر بلی کو ایک زور دار ٹھڈا رسید کیا، پھر وہ گھر سے نکل کر کنوئیں کی جانب چل پڑا۔ رستے میں وہ چھوٹے بڑے ڈھیلوں اور روکھی سوکھی جھاڑیوں کو ٹھڈے مارتا اور اکھاڑتا گیا۔ کنوئیں پہ وہ ایک شیشم کے درخت کے نیچے جا بیٹھا اور سوچنے لگا کیا ہی اچھا ہو اگر وہ واپس اپنے گھر جا کر رہنے لگے۔ اس خیال کے آتے ہی اُسے گمان ہوا کہ وہ واپس اپنے گھر میں پہنچ گیا ہے اور پہلے کی طرح وہاں رہ رہا ہے۔ بابا گھر میں چل پھر رہے ہیں، اور جہاں جہاں جاتے ہیں وہیں وہیں سے کبھی اپنے آپ سے کبھی اُس کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں۔ بس احساس سے اس کے جسم کو بڑا آرام پہنچا۔ وہ آنکھیں موند کر درخت کے سائے میں لیٹ گیا اور لیٹتے ہی چند منٹ کے لیے گہری نیند سو گیا۔ جب اس کی نیند کھُلی تو اُس کی آنکھیں ابھی بند تھیں اور وہ اُسی حالت میں پڑا تھا۔ باہر کی (جسم سے باہر کی) آوازوں سے اور پپوٹوں کے اندر سے آتی ہوئی روشنی سے پتا چلتا تھا کہ اُسے سوتے ہُوئے کوئی وقت نہ گزرا تھا۔ مگر اُس کا بدن اپنے دل کے گرد ایسے آرام اور سکوت کی حالت میں پڑا چل رہا تھا کہ خیال ہوتا تھا کئی گھنٹے کی نیند سے جاگا ہے۔ اُس کا ذہن شیشے کی مانند صاف اور شفاف تھا، اور اُس وقت اس کوری سطح پر دفعتہً ایک انکشاف اُبھرا ـــــ کہ ایک نایاب گُر اُس کے ہاتھ آگیا ہے، کہ اب وہ جب بھی اور جہاں پر بھی چاہے آناً فاناً میں پہنچ سکتا ہے اور جو چاہے کر سکتا ہے اور کوئی اُس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا، کہ اس پر کوئی لاگت

نہیں آتی اور کوئی شے درکار نہیں ہوتی، بس آنکھیں بند کرنے کی دیر ہے، کہ جو کچھ وہ کسی وقت میں کر رہا ہوتا ہے وہی کچھ کرتے رہنے کی یا وہیں پر رہتے جانے کی اُس کو کوئی مجبوری نہیں ہے۔ اپنے گرد وپیش سے اچانک آزادی حاصل کر لینے کی اس دریافت پر اُس کے اندر بجلی سی کوند گئی اور اُسے محسوس ہُوا جیسے اُس کے کندھوں پر اُن دیکھے پر اُگ آئے ہوں۔ پر اُس بچے کے زمانے کی ایک نئی سمت تھی جو لامکاں تھی، پر اس کے باوجود اُس کے لیے ایک پناہ گاہ کی صُورت تھی۔ یہ اس سمت کا کمال تھا۔ پہلے پہل آنکھیں میچ کر ہی یہ سمت نظر آتی، پھر جب اعتماد پختہ ہو گیا اور اُسے اس بات کا یقین حاصل ہو گیا کہ اب یہ اُس کے ہاتھ سے نکل کر کہیں نہیں جاتی تو وہ آنکھیں کھول کر اس سمت کو دیکھنے اور اپنی مرضی کے مطابق اسے استعمال کرنے لگا۔ موہوم سا تخیل جیتے جاگتے خوابوں میں بدل گیا۔ یہاں سے کہانیوں کی دریافت کا سلسلہ شروع ہوا۔

کہانیاں پہلے اُس نے اپنے استعمال کے لیے ایجاد کیں، پھر دوسروں کی خاطر۔ پہلے کہانیوں میں صرف وہی ایک ہوتا جو مختلف جگہوں اور وقتوں اور مختلف صورتوں میں پیدا ہوتا اور منزلیں سر کرتا۔ پھر ان کہانیوں میں دُوسرے لوگ بھی شامل ہونے لگے، چھوٹے اور بڑے، اُس کے سکول کے ساتھی اور دوست اور اُستاد اور کہانیاں لمبی ہوتی گئیں حتّیٰ کہ ایک وقت آیا کہ وہ واقعے کو واقعے سے اور قصّے کو قصّے سے جوڑتا چلا جاتا اور کہانی ختم ہونے میں نہ آتی اور جیسے جیسے کہانی بڑھتی جاتی وہ فخر اور آزادی کے احساس سے پھُولا نہ سماتا۔ اُس کی اس بات نے اُسے اپنے ساتھیوں میں بہت مقبول بنا دیا۔ ساتھیوں میں اُس کے ہم جماعت لڑکے تھے اور کسان مزارعوں کی لڑکی جو کنوئیں پہ رہا کرتی۔ لڑکی اسکی ہم عمر تھی اور وہ تقریباً ہر روز سہ پہر کے وقت کنوئیں کے عقب میں کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھ کر اُس دہقان لڑکی کو لمبی لمبی بے معنی مسحور کن کہانیاں سُناتا۔ مگر چند کہانیاں ایسی بھی تھیں جو اس نے صرف اپنی خاطر بچا کر رکھی تھیں۔ ان کہانیوں میں اِنسانی کردار صرف اُس کا اپنا ہوتا اور باقی سب چرند پرند اور درندے، کھیت اور جنگل، دریا، پہاڑ اور طوفان ہوتے۔ ان کہانیوں میں وہ بیشتر حیرتناک شجاعت کے کارنامے انجام دیتا اور یہ ایسی کہانیاں تھیں جنہیں وُہ اپنے مُشکل ترین وقت پہ استعمال کرتا۔ جب کبھی موسم شدید ہوتا یا راستہ سخت تر وہ اپنے آپ سے یا بلبل سے یا ٹیلے ہی ہوا میں منہ اُٹھا کر ان کو اونچی آواز میں دُہراتا۔ اس سے راستے کا سفر ذرا آسان ہو جاتا۔ چنانچہ گاؤں میں چچا کے گھر رہتے ہوئے اُس نے جن باتوں میں مہارت حاصل کی تھی کہانیاں اُن میں سے ایک تھیں۔۔

دُوسری بات اُس کی پڑھائی تھی۔ آٹھویں جماعت میں وظیفہ حاصل کر کے وہ ہائی سکول میں پہنچا۔ اُن کے گاؤں سے دو فرلانگ پر نہر بہتی تھی جہاں اس نے تیرہ سال کی عمر میں تیرنا سیکھا تھا۔ موسم ذرا کھُلتا تو گاؤں کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ وہ دن دن بھر نہر میں نہاتا رہتا حتیٰ کہ دھوپ اُس کی جلد کو جلا کر سیاہ کر دیتی۔ یہیں پر وہ اُلٹا اور سیدھا، ایک ہاتھ سے اور ہاتھ پاؤں باندھ کر، بہاؤ کے ساتھ اور اُس کے مخالف تیرتے ہُوئے پَیراکی میں مشّاق ہوا تھا۔ سارا دن

اور بجادوں کی بارشیں شروع ہوتیں تو دیکھتے ہی دیکھتے نہر کا پانی پُل کے ساتھ لگ کر بہنے لگتا، اور کبھی کبھی کوئی کنارا کہیں سے ٹوٹ جاتا تو اُن کا گاؤں تک پانی کی لپیٹ میں آجاتا۔ اُن دنوں میں اُس کا جی چاہتا کہ نہر کے اِس بھنور کھاتے ہوئے تیز رفتار سمندر میں کود جائے اور دُور تک تیرتا ہوا چلا جائے۔ پانی کے معاملے میں خوف نام کی کوئی شے اُس کے پاس بھی نہ پھٹکتی تھی، مگر چچا اُن دنوں میں اُس کا تیرنا بند کر دیتے کہ سیلابی پانی میں سانپ پائے جاتے ہیں۔ وہ نویں میں تھا کہ اُن کے سکول سے تین لڑکوں کو بین السکول کھیلوں کے مقابلے میں حصہ لینے کے لیے پیراکی کی ٹیم کے طور چُنا گیا۔ اُن تین میں ایک اسد تھا اور ٹیم کا کپتان تھا۔ پیراکی کے مقابلے کمپنی باغ کے تالاب میں منعقد ہوئے۔ پانی کا وہ کیڑا تھا، چار لمبائیوں کی دوڑ جیت گیا۔ اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز نے اُس کے ساتھ ہاتھ ملا کر ایک چھوٹا سا نکل پالش والا چمکدار کپ اُس کو پکڑایا اور دوبارہ ہاتھ ملایا۔ چچا بھی وہاں تھے۔ اُنہوں نے مسکرا کر آہستہ سے کہا "ویری گڈ"، اور اُسے ساتھ لے کر گھر لوٹ آئے۔ گھر پہنچ کر وہ سیدھا کنوئیں کی طرف نکل گیا۔ دہقان لڑکی جو پہلے کسی پالتو جانور کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے چلی آتی، اب نہ آیا کرتی تھی، کہ آخر لڑکی تھی، کہانیوں کی عمر سے جلد ہی نکل گئی، اسد کی طرح عمر بھر کے لیے اُن کے جھنجھٹ میں نہ پھنس گئی تھی۔ وہ کیکر کے نیچے جا کر بیٹھ گیا اور بیتابی سے اُس عجیب و غریب واقعے کو یاد کرنے لگا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے پیش آیا تھا۔ اُس نے اپنے نام کی آواز کو فضا میں گونجتے ہوئے سنا اور اس پہ سینکڑوں لوگوں کو تالیاں بجاتے ہوئے دیکھا۔ پھر اُس نے دیکھا کہ وہ عظیم شخصیت اُس کو انعامی کپ پیش کر رہی ہے اور بیسیوں مہربان چہروں والے، خوبصورت چشمے لگائے ہوئے خوش لباس لوگ شفقت سے اُسے دیکھ رہے ہیں — یہاں سے اُسے ایک نئی ڈگر مل گئی اور وہ سوچے سمجھے بغیر اُس پہ نکل پڑا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ ایک جہاز کے عرشے پہ کھڑا ہے اور اُس نے نیلے رنگ کے ریشم کا جانگیہ پہن رکھا ہے جب کہ سمندر پہ دھوپ چمک رہی ہے۔ اچانک اُس کو دور ایک جزیرہ دکھائی دیا اور وہ کسی کو بتائے بغیر ہوا میں ہاتھ سیدھے کر کے سمندر میں کود گیا۔ ایک طاقتور مچھلی کی طرح کبھی سطح سمندر کے نیچے کبھی اُوپر تیرتا ہوا وہ جزیرے کی طرف بڑھنے لگا، مگر جزیرہ جو پہلے وہاں سے قریب ہی معلوم ہوتا تھا اب پیچھے ہی پیچھے ہٹنے لگا۔ مگر پریشانی یا گھبراہٹ کے نام سے وہ واقف نہ تھا۔ تن تنہا وہ جوش کھاتے ہوئے سمندر سے لڑتا، غوطہ لگا کر لہروں کی دیواروں کے نیچے سے نکلتا، ایک دن اور ایک رات تک مسلسل اور بے تکان تیرتا رہا حتیٰ کہ اگلے روز صبح صادق کے وقت جزیرے کے ساحل پہ جا کھڑا ہوا۔ ساحل پہ اُس کے استقبال کی خاطر جزیرے کے سب لوگ جمع تھے۔ اُس مجمعے کی سربراہی جو لوگ کر رہے تھے ان کی لمبی لمبی سفید داڑھیاں تھیں اور انہوں نے قیمتی چوغے پہن رکھے تھے۔ سر پہ اُن کے سُرخ پگڑیاں تھیں اور آنکھوں پہ نازک فریموں والے چشمے۔ انہوں نے اسد کے ساتھ ہاتھ ملایا اور شفقت سے اُسے دیکھتے رہے۔ پھر اُنہوں نے اُس کو ایک بہت بڑا سونے کا

کپ، جو اُس کی کمر تک آتا تھا، پیش کیا، جس پر یہ الفاظ کُھدے تھے: "اسد کریم۔ جس نے کسی کو بتائے بغیر، تن تنہا، بیس گھنٹے تک تیر کر جہاز سے جزیرے تک کا راستہ طے کیا۔"

وہ زیادہ دیر وہاں رُکا نہیں، اُسے اپنا جہاز پکڑنا تھا۔ چنانچہ اس نے اُن شفیق چہروں والے بزرگوں کا شکریہ ادا کیا اور کپ کو بغل میں دبا کر واپس سمندر میں کُود پڑا۔ اب جہاز، کچھ فاصلے اور کچھ دھند کی وجہ سے آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ مگر اُسے قریب قریب اُس سمت کا پتا تھا جس طرف کو جہاز نکل گیا تھا۔ چنانچہ کچھ اپنے علم اور کچھ چھٹی حِس پر اعتماد کرتا ہوا وہ ایک بازو کی مدد سے تیرتا، جہاز کی سمت میں بڑھنے لگا۔ سارا دن اسی دُھند آلود سمندر میں نکل گیا، حتیٰ کہ رات پڑ گئی اور پورے بارہ گھنٹے کی سخت پیراکی کے بعد پہلی بار اُسے دھند میں سے جہاز کی روشنیاں نظر آئیں۔ وہ ایک بازو کی پُوری قوت سے تیرنے لگا، مگر جہاز آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ ساری رات جہاز کے تعاقب میں بسر ہوئی۔ صُبح جب ہوئی تو سمندر رُک گیا تھا اور جہاز سے اُس کا فاصلہ چند سو گز کا رہ چکا تھا۔ وہاں سے اُس نے دیکھا کہ جہاز کے سارے مسافر اور عملہ عرشے پر جمع ہیں اور سب کی نظریں اس پر لگی ہوئی ہیں۔ کئی لوگ دُوربینوں کی مدد سے اُس کی حیرتناک بہم جوئی کا نظارہ کر رہے ہیں اور کئی کیمروں سے تصویریں اُتار رہے ہیں۔ مگر خاموشی کا ایک عالم تھا کہ پُرسکون پانی کی سطح پر ہوا کی آواز بھی سُنائی دیتی تھی۔ اُس نے "تازہ" تازہ دھوپ میں چمکنے کا کپ ایک ہاتھ سے اُٹھا کر سر کے اُوپر لہرایا، اور اُس مجمعے میں سے دفعتاً ایک مہیب نعرہ بلند ہوا۔ رسّی کی سیڑھی پھینکی گئی، جس کو ایک ہاتھ سے پکڑ پکڑ کر وہ چشم زدن میں عرشے پر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے سونے کا کپ اُن لوگوں کے درمیان جا رکھا اور ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔ اب سب لوگ، مرد عورتیں اور بچے، اُس کے گرد جمع ہو گئے اور حیرت سے کبھی اُسے اور کبھی کپ کو دیکھنے، تالیاں بجانے اور اُس کی پیٹھ تھپکنے لگے۔ اس ہجوم میں کہیں بابا بھی تھے جو اُس کے برابر کھڑے ہوئے اور اُس کے شانوں کے گرد بازو ڈال کر تصویر اُتروانے لگے۔ اور پرے کہیں چچا کا چہرہ بھی تھا جو قہقہے لگا رہا تھا اور خوشی کے مارے ناچ رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ کہانی اُس کے اپنے لیے تھی۔ اُس نے دل میں فیصلہ کیا۔ بعد میں اس میں ردّوبدل ہو گی، بڑی بڑی مچھلیاں اور دُوسرے سمندری درندے جن کے ساتھ اُس کی جنگ ہو گی مگر جو صورت بھی بنی اس کہانی کو وہ خاص اپنے لیے رکھے گا۔ رات کو اُس نے چچا کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا اور خاموشی سے سونے کے لیے چارپائی پر چلا گیا۔

(تکیے پر سر رکھ کر اُس نے آنکھیں بند کیں تو کمرے کی دیوار کے ساتھ، حسبِ معمول بندوق کھڑی تھی جس کی نالی اُس کی پہنچ میں تھی۔)

میٹرک کے امتحان میں اُسے دو سال کا وظیفہ ملا جس پر وہ اپنی یونیورسٹی کے کسی بھی کالج میں داخلہ لے سکتا تھا۔

وہ لاہور جانا چاہتا تھا، مگر چچا نے اِس بات پر منع کر دیا کہ بہت دور ہے۔ اس کی بجائے وہ اپنے نزدیکی بڑے شہر کے کالج میں داخل ہو گیا جو گاؤں سے بیس میل کے فاصلے پر تھا۔ اُس نے ہوسٹل میں رہنا چاہا مگر چچا نے اجازت نہ دی، چنانچہ وہ بائیسکل پر اپنے شہر کے سٹیشن تک جاتا، سائیکل کو چچا کے ایک دوست کی دکان پر کھڑا کرتا اور ریل گاڑی پکڑ کر اگلے شہر پہنچتا۔ کبھی کبھی جب موسم اچھا ہوتا اور اُس کی طبیعت خوشگوار ہوتی تو وہ سائیکل پر ہی بیس میل کا فاصلہ طے کرتا۔ اُس کے شہر سے اگلے شہر تک پکی سڑک تھی اور کالج سڑک کے کنارے پر تھا۔ سکول اور کالج کی فضا کا فرق ایک اَن سُنے دھماکے کی طرح اُس کو لگا۔ کالج میں نئے ساتھی ملے، اور ایک دوست ریاض، جو ہوسٹل میں رہتا تھا اور ایک بڑے زمیندار کا بیٹا تھا۔ وہ اپنے خالی پیریڈ ریاض کے ہمراہ کالج میں گھومتے ہوئے یا ہوسٹل کے کمرے میں گزارتا۔ تاریخ، معاشیات اور اُردو اُس کے مضمون تھے۔ اُن دنوں میں اُردو شاعری کو اُس نے پہلی بار پڑھا۔ ایک کالج کی دُنیا تھی، ایک شاعری کی —— ایک آزادی جسم کی اور ایک ذہن کی —— اور اِن دونوں کے ملاپ کی فضا ایک پَیراکی کی تھی۔ شہر کے کسی دولت مند نے دو سال پہلے کالج کو ایک سوئمنگ پول بنوا کر دیا تھا، جس میں سفید کنکریٹ کی سیڑھیاں شیشے کی مانند پانی میں اُترتی تھیں اور سفید فرش ایک سرے سے دُوسرے سرے تک ڈھلوان جاتا تھا۔ تالاب کے گرد جنگلا بنا تھا جس پر ہاتھ رکھ کر نوجوان آنکھوں والے لڑکے پہروں تک پانی میں جھلملاتے ہوئے فرش کو دیکھتے رہا کرتے تھے۔ اور گہرے پانی والے سرے کے اُوپر بارہ فٹ کی بلندی پر، بید کی طرح تھرتھراتا ہوا تختہ نصب تھا۔ یہ کیا تھا؟ اِس سے پہلے اُس نے کبھی اُونچائی سے پانی میں سر کے بل غوطہ نہ لگایا تھا، نہ نہر کے پُل سے دیکھیں سے، صرف کسانوں کی طرح نہر کے کنارے سے ٹانگیں پھیلا کر پانی میں چھلانگیں لگائی تھیں مگر پانی کے گُر اس کے بدن میں موجود تھے، تختے سے غوطہ لگانا اُس کو کسی سے سیکھنا نہ پڑا۔ صرف ایک بار اُس نے ایک لڑکے کو ہوا میں ہاتھ اُٹھا کر تختے سے اُچھلتے اور غوطہ لگاتے ہوئے دیکھا اور بس۔ وہ جا نگیہ پہن کر اُس لرزاں تختے پر جا کھڑا ہُوا اور وہاں اُس نے ہاتھ اُٹھائے، جیسے ناچ شروع کرنے کے لیے بازو آسمان کی جانب بلند کرتے ہیں، اور ہوا میں کُود کر نیم قلابازی کی شکل میں بدن کا رُخ پانی کی سیدھ میں کیا جیسے شکاری پرندے کبھی زمین کا نشانہ باندھ کر ہوا میں ایک لمبا اور تیز غوطہ لگاتے ہیں، اور تیر کی طرح سطح کو چیرتا ہُوا اُس کی مخملیں تہوں میں دُور تک اُتر گیا۔ اندر اُس نے آنکھیں کھولیں اور بڑی سی بادامی رنگ کی مچھلی کی طرح، مچھلی کی سی آزادی اور سہولت کے ساتھ پانی کے اندر گھومتا پھرتا، وقفے وقفے پر ہوا کے بُلبلے چھوڑتا، فرش کو قریب سے دیکھتا چاروں دیواروں پر گھوم گیا۔ پھر سیڑھیوں کے پاس پہنچ کر اُس نے سر پانی سے نکالا اور جنگلے پر جُھکے ہوئے چند لڑکے دم بخود رہ گئے۔ ایک اصل نسل پیراک آبی سہولت جس کے بدن کا جُزو تھی، اُن کے درمیان وارد ہوا تھا، جس کو پانی کے اندر اپنے دم پر اتنا اختیار

تھا کہ باہر کھڑے ہونے والوں کو گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ ایک بار غوطہ لگانے کے بعد ایک بار پھر اور پھر اور پھر — اپنے آپ کو روکنا جیسے اُس کے لیے دشوار ہو گیا۔ وہ قوت اور وہ آزادی — پانی کی ملائم اور گھنی تہوں کو تیر کی سی تیزی اور صفائی کے ساتھ چیرتے ہوئے، جُدا کرتے ہوئے دور تک داخل ہوتے جانے کا عمل، وہ تہیں جو جُدا ہونے پہ ڈھے نہ جاتیں بلکہ اپنے دبیز گدوں پہ اُسے سہارتیں اور چشم زدن میں اُس کے بدن کو ہلکا پھلکا اور حرکت سے بے نیاز بنا دیتیں کہ وہ اپنے پیٹ پہ، اور کبھی پلٹ کر اپنی پُشت پر بے وزن پڑا چھوٹی چھوٹی لہروں پہ بہتا اور ہچکولے کھاتا رہتا، اور پھر ان سب سے اوّل، شروع میں، ہوا میں لپکتی، ہوا کو پھاندتی ہوئی، ہوا میں قوس بناتی ہوئی، اُنگلیوں کے پوروں سے پاؤں کی ایڑیوں تک مُحیط، مدار سے محور کو لے کر جاتی ہوئی طویل چھلانگ! — وہ قوت اور وہ آزادی اُس کے دل میں اُتر گئی، یہاں تک کہ اب بدن کی قوس کے منتہا تک پہنچنے سے پہلے ہی نیچے جل تھل پانی کی سطح میں، سوئی کے ناکے ایسے مہین ایک نقطے پہ اُس کی نظر بندھی ہوتی، اور یہ وہی نقطہ ہوتا عین جس کے اُوپر وہ سطحِ آب میں داخل ہوتا۔ ایک لمحے کو وہ آنکھیں موندتا، پھر کھول دیتا۔ آج تک نہر کے گدلے پانی میں ڈبکی لگانے کی دُنیا اُس کے واسطے اندھیری رات کی دُنیا رہی تھی جہاں آنکھ کھولنے کی ہمت نہ ہوتی۔ اب وہ اس طرح آنکھیں کھول کر پانی میں سفر کرتا جیسے شیشے میں دیکھ رہا ہو۔ ہر روز کلاسیں ختم ہونے کے بعد وہ وہاں پہ موجود ہوتا جب تک کہ جاڑوں کا موسم شروع ہونے پر کالج والے تالاب کو خالی نہ کر دیتے۔ ہر روز سہ پہر کی دھوپ میں اُس کا پتلا اور لمبا، سیدھا بدن اپنے آپ میں مگن، صرف اپنے اور پانی کے ایک نقطے کے درمیان والے فاصلے سے باخبر، ہوا میں مُعلق تختے پر کھڑا نظر آتا۔ پھر بڑی آہستگی سے بازو ہوا میں اُٹھتے اور ایک لمحے سے بھی کم مدت میں، جیسے بجلی کوند جائے، اُس کا پنجا پنجا جی اٹھتا اور وہ باقابو آہستگی ایک حیرتناک سُرعت کے جبر میں بدل جاتی۔ اس طرح وہ گویا کسی اَن سُنے سازینے کی دُھنوں پر حرکت کرتا ہُوا غوطے پہ غوطہ لگاتا چلا جاتا۔ اب وہ یاد کرتا تو وہ وقت شاید اُس کی زندگی کا خوشگوار ترین وقت تھا۔

یہیں پر پہلی بار اُس کی سانس ٹوٹی تھی۔ اسی طرح وہ ایک غوطہ لگا کر اُبھرا تھا اور پانی کے اُوپر اپنی پُشت پر لیٹا ہولے ہولے ہاتھوں اور پاؤں کے چپّو چلا رہا تھا کہ سانس اُکھڑنی شروع ہوئی، جیسے اُس کا کچھ حصہ اندر ہی اندر گم ہوتا جا رہا ہو۔ پہلے کم کم، بے معلوم سی، پھر کچھ اور، پھر اور زیادہ۔ کچھ ایسا احساس کہ کوئی خشک تنکا چھاتی میں پھنس گیا ہے اور سانس کو جذب کرتا جا رہا ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اُس نے گہرا سانس لینے کی کوشش کی مگر لیا نہ گیا۔ وہ تالاب سے نکل کر کنارے پہ بیٹھ گیا۔ اُس نے گھٹنے اُٹھا کر بازو اُن کے گرد باندھے اور پیشانی گھٹنوں پہ رکھ کر سانس جاری کرنے کی کوشش کی۔ جو سانس بھی وہ کھینچتا وہ آدھی اندر رُک جاتی، پھر آدھی

سے زیادہ رُکنے لگی۔ یُوں معلوم ہوتا کہ پسلیوں کی دراڑوں میں ٹھونس ٹھونس کر سانس کو بھرا جا رہا ہے، جیسے کسی تھیلے میں رُوئی کو بھرا جاتا ہے، پھر تھیلے کا مُنہ مروڑ کر اُس کا گلا بنایا جاتا ہے اور گلے پر کَس کر رسّی کی گانٹھ دی جاتی ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے، کہاں جائے۔ خوف کے مارے اُس کی سوچ معطّل ہو گئی تھی۔ اسے خیال آیا کہ وُہ مر رہا ہے۔ اگر وہ چلے پھرے، کہیں چلا جائے، کچھ نہ کچھ کرنے لگے تو شاید یہ وقت ٹل جائے، مگر جب اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی تو ہل بھی نہ سکا۔ کچھ دیر کے بعد اس میں بیٹھنے کی ہمّت بھی نہ رہی۔ تالاب کے کنارے، کنکریٹ کے فرش پہ لیٹے لیٹے اُس نے دھوپ میں دمکتے ہُوئے نیلے اور انتہائی بلند آسمان کو حیرت سے دیکھا، جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو، بہت اُونچی اُڑتی ہوئی تین چیلوں کو دیکھا، اور دہشت کے آنسو اُس کی کنپٹیوں پر بہتے ہُوئے کانوں میں ٹپکتے رہے۔

پھر اچانک یہ ریلا گُزر گیا۔ چھاتی کی سُوجن آہستہ آہستہ کم ہونے لگی اور سانس واپس آنے لگی۔ بہت آہستہ آہستہ، احتیاط کے ساتھ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور غور سے اپنے بدن کو دیکھنے لگا۔ اُس کا بدن پہلے کی طرح تندرست تھا۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ اُس کی کمر اور ٹانگوں کی قوّت برقرار تھی۔ اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ کیا گزری ہے۔ اُس کے بدن پر اس واردات نے کسی قسم کے اثرات نہ چھوڑے تھے۔ اُس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اُس وقت، جب وہ لیٹا آسمان کو دیکھ رہا تھا اُس کے علاوہ تالاب پر اور کوئی نہ تھا۔ چند گھنٹوں میں وہ اس واقعے کو بھُول گیا — تین ہفتے گُزر جانے کے بعد یہ واقعہ دوسری بار پیش آیا، بالکل پہلی والی شکل میں، ایک غوطے کے عین بعد۔ اب کی بار سانس کا ریلا کچھ زیادہ دیر تک رہا، لیکن اب وُہ پہلے کی طرح خوفزدہ نہ ہوا۔ اب کے اُسے شک ضرور گزرا کہ یہ کوئی اتفاقیہ بات نہ تھی، بلکہ کسی قسم کی بیماری تھی جس کا اُسے علم نہ تھا۔ پھر بھی اُس نے کسی سے اِس کا ذکر نہ کیا۔ اُسے دل میں کچھ ایسا خیال تھا کہ اگر کسی کو اِس کا علم نہ ہو پایا تو یہ شاید اُسے چھوڑ جائے گی۔ اب بہرحال اُس نے تختے سے غوطے لگانے چھوڑ دیے، بس ہولے ہولے تیرا کرتا۔ جب اس پر تیسری بار حملہ ہوا تو اُسے کالج کے ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا۔ پانچویں حملے کے بعد ڈاکٹر نے اُسے سپیشلسٹ کے پاس بھیج دیا۔ دَورے نہ رُکے۔ یہ بھلا کیسی علّت تھی؟ یہ سانس کی بیماری کی ایک شکل تھی مگر کیسی شکل تھی سپیشلسٹ نے پہنچے اور مایُوسی سے سر ہلا ہلا کر اپنی کم علمی کا اظہار کیا، اِس شکل سے وہ آشنا تھا۔ دوروں کی رفتار، اُن کا اختصار، اس کے دُوسرے اطوار اُس کے تجربے میں نہ آئے تھے۔ بہرحال، اُس نے کہا، مکمل جو۔ پر تو یہ علّت قریب قریب لاعلاج تھی، مگر پرہیز سے، یا قسمت کے زور سے، کافی حد تک قابو میں رکھی جا سکتی تھی۔

اُسے کہا گیا کہ وہ تیرنا، تیزی سے سائیکل چلانا یا اونچائی کی طرف بھاگنا ترک کر دے۔ ہدایت ہوئی کہ معتدل رفتار پر لمبی سیر کی جائے۔ اُس نے معتدل رفتار پر لمبی سیر کرنا شروع کر دی۔ اونچائی سے غوطہ لگانے کی اُس کے دل میں کبھی

کبھی حسرت پیدا ہوتی، مگر اس سے بھی زیادہ حسرت اُس کو اپنی پرانی دنیا کی ہوتی جس پہ اُس کی گرفت اب ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ پہلے وہ جہاں پر بھی ہوتا جو کچھ بھی کر رہا ہوتا، کرتا رہتا، اور ساتھ ہی ساتھ اُس کو چھوڑ چھاڑ کر کہیں اور بھی چلا جاتا اور کچھ اور کرنا شروع کر دیتا۔ اب وہ ضبط ناپید تھا۔ سانس کا ریلا جب آتا تو وہ جتنی بھی جدوجہد کرتا اس کے حصار سے نکل نہ سکتا۔ اُسے معلوم ہوا جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہے۔ نہ کوئی واقعہ، نہ قصہ نہ کہانی۔ وقت نہ آگے چلتا تھا نہ پیچھے، بس جسم کی اذیت میں بدلتا جاتا تھا۔ بالآخر اُسے معلوم ہوا کہ دل کی اُڑان والی وہ مجرد سمت جو اپنی حکمتِ عملی سے اُس نے دریافت کی تھی، جس کے ساتھ وہ وقت کے جبر کا مقابلہ کیا کرتا تھا اور کبھی کبھی اُسے تسخیر کر لیتا تھا، جسم کی بدامنی کے سامنے ڈھے گئی تھی۔ عجیب بات تھی کہ کچھ عرصے کے بعد خود اُس کے دل میں واپس وہاں جانے کی خواہش ماند پڑنے لگی، جیسے کہ اُس کی کشش محض ظاہری کشش تھی جو ابتلاء کے ایک اصل مقام پہ ریزہ ریزہ ہو گئی تھی۔

قریب قریب اُسی وقت سے کتابوں کی دریافت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اُن جادو کی پٹاریوں میں ایک ایک جہان دفن تھا جس کی بازیافت کو نہ کیل درکار تھی نہ کانٹا، جن تک پہنچنے، چلنے پھرنے اور بھیس بدلنے کا عمل تنہائی میں بلا شرکتِ غیرے، از خود مکمل تھا۔ اس پڑھائی نے اُس کی طالب علمی کو فائدہ پہنچایا۔ پہلے سال کا امتحان اُس نے آسانی سے پاس کر لیا۔ اگلے سال، گرمیوں کی چھٹیوں کے فوراً بعد، اُس نے ریاض کی حمایت میں، جو یونین کا جوائنٹ سیکرٹری کھڑا ہوا تھا، کالج کے الیکشنوں میں زور شور سے حصہ لیا۔ یہ اُس کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ عمر میں پہلی بار اُس نے اپنے ذاتی عمل سے نکل کر کسی اجتماعی جدوجہد میں حصہ لیا تھا۔ ایک واضح اور ٹھوس منزل کی جانب اجتماعیت کے اِس سفر نے ایک انوکھی کیفیت سے اُسے روشناس کرایا۔ ایک گروہ کا حصہ ہونے پر جو سہولتیں اور آزادیاں اُس کو حاصل ہوئیں اُن سے وہ اب تک نابلد رہا تھا۔ پہلی بار اُس کو پتا چلا کہ اُس کے دل میں عمر بھر سے شاید، ایک نامعلوم سا غصہ دبک کر بیٹھا ہوا تھا جس کو باہر نکلنے کا کبھی موقع نہ ملا تھا۔ اِس کا علم اُس کو ایک ایک لڑکے کے پاس جا کر کنویسنگ کرتے ہوئے مخالف گروہوں کے ساتھ مقابلوں، مناظروں اور تُو تُو مَیں مَیں کے دوران ہوا۔ اکثر وہ چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھڑک اُٹھتا۔ جب وہ مقابلہ ہار گئے تو کالج کے باہر اُن کے اور دو مخالف گروہوں کے درمیان بڑے ڈنڈوں، ہاکیوں اور پیتل کے ٹکڑوں سے تین طرفہ لڑائی ہوئی جس میں اُس کا سر پھٹ گیا۔ کالج کے پرنسپل نے کہہ سن کر پولیس کی مداخلت کو روک دیا، اور اسد سمیت چار لڑکوں کو جن کے سر لڑائی شروع کرنے کی ذمہ داری آئی، ایک ایک سو روپیہ جرمانہ کیا، جو اُس زمانے میں کبھی سنا بھی نہ گیا تھا۔ ایک سرکشی تھی جو عجیب تسکین بخش طور پر ابھرتی اور اُسے بڑی جماعت کے لڑکوں اور اُستادوں تک سے سوال جواب کرنے کی ہمت دیتی، اُس کے سینے میں تنہائی کی پھانس کو نرم کرتی۔ اُس کی سرکشی کی بھی ایک پُرکار کہانی تھی جس کا تعلق بغاوت سے کم اور عقلِ سلیم سے زیادہ تھا۔ اُس زمانے میں اُس کی سمجھ میں نہ آتا کہ ایک بات — کوئی بھی بات